رنگِ خیال

عقیدہ وعمل کا باہمی تلازم

ہر شخص اپنے اعمال کے سبب گروی ہوگا۔ سوائے سیدھے ہاتھ والوں کے۔ وہ باغوں میں ہوں گے۔ مجرموں کے باب میں باہم پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے (پھر دوزخیوں سے پوچھیں گے) تم سقر (جہنم) میں کیسے پہنچے؟ کہیں گے ہم مصلّین میں سے نہیں تھے۔ اور نہ ہم غریب مستحق لوگوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ بلکہ ہم مین میکھ نکالنے والوں کے ساتھ مل کر مین میکھ نکالا کرتے تھے۔ اور ہم فیصلہ کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمیں موت نے پکڑلیا۔ (المدثر ۳۸۔۴۷)

رب کا قانون مکافاتِ عمل اور ردِ عمل سے بندھا ہوا ہے۔ جس طرح ہر معلول اپنی علت کے ساتھ ہر مسبّب اپنے سبب کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اس قانون کی وضاحت اوپر کی آیات سے ہوتی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہوگا۔ صرف داہنے ہاتھ والے ہی اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ بالفاظ دیگر عمل سے ہی نجات ہوگی اور عمل سے ہی ہلاکت۔ اس دن رہائی کی صورت بجز اپنے اعمال کے کوئی نہیں۔ جس کی تیاری کا وقت یہی دنیا ہے۔ آنکھ بند ہونے کے بعد قیچہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

یہاں جہنم میں جانے کے چار اسباب بتائے گئے۔ مجرموں کی زبان سے کہلوایا گیا ہے:

(۱) ہم نماز نہیں پڑھتے تھے (ہم متقین میں سے نہیں تھے۔

(۲) مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔

(۳) قرآن کو ماننے کے بجائے، اس میں ابتدائی طور پر مین میکھ نکالا کرتے تھے۔

(۴) جزا وسزا کے دن کو جھٹلاتے تھے۔

مذکورہ بالا چار جرائم میں سے تین کا تعلق اعمال کی دنیا سے اور ایک کا تعلق عقائد کی دنیا سے ہے۔ اگر کوئی شخص مرنے کے بعد جزا وسزا کا قائل نہ ہو تو اس کا ہر عمل لامحالہ، اس کے عقیدہ کا نمائندہ ہوگا۔ پھر ایسے شخص سے کسی خیر کی توقع رکھنا بھی فضول ہوگا۔ کیونکہ اعمال انسانی کی اصلاح و درستگی کا بنیادی جوہر اسی عقیدہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان دل سے تسلیم کرلے کہ مرنے کے بعد اس کے ہر عمل کا بدلہ ضرور مل کر رہے گا تو وہ کسی بھی عمل کو کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچ لے گا کہ اسے یہ کرنا چاہیے یا نہ؟

اعمالِ صالحہ کی انجام دہی اسی عقیدہ کی رہین منت ہے۔ اسلام نے توحید و رسالت کے ساتھ اسے بھی اساسی عقیدہ قرار دیا ہے۔ عقیدہ کو عملی نظریہ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اعمالِ صالحہ کی پیدائش اور اس کی افزونی کا سبب بنتا ہے۔ عقیدہ کسی حقیقت کو صرف مان لینے کا نام نہیں بلکہ وہ تحرک عمل سے عبارت ہے اور اسی معنی میں اسے عملی نظریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (مدیر اعلیٰ)

مسلم مفسرین کو جدید افکار کا چیلنج

ڈاکٹر ریحانہ فردوس
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

انیسویں صدی کے آغاز میں جب مغرب کی استعماری طاقتوں نے دنیائے اسلام پر قبضہ کرنا شروع کیا تو ان کو اسلامی علوم سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ یہ دلچسپی کسی اخلاص پر مبنی نہ تھی بلکہ علمی طور پر وہ اسلام کے اندر ایسی خورد برد کرنا چاہتے تھے جس سے نئی نسل متاثر ہو خود مسلمانوں کو اس سے نفرت ہو جائے اور وہ اپنے دین کو بیکار اور خلاف عقل سمجھ کر رد کر دیں۔ انہیں مقاصد کے پیش نظر غیر مسلم اسکالرز نے اسلامی علوم کے ہر شعبہ میں کام شروع کیا اور اپنے طور پر تحقیق کا بہت بلند معیار پیش کیا اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے طریقہ تحقیق، مسائل کے تجزیے اور طریقہ استنتاج میں اس قدر کشش تھی کہ نئی تعلیم کے فارغ شدہ بہت سے مسلمان ان کے فریب میں آگئے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

تمام اسلامی علوم کے بارے میں جو ان مستشرقین نے کام کیا اس کا احاطہ کرنا تو یہاں ممکن نہیں البتہ زیر نظر مقالے میں ہم ایک موضوع پر ضرور گفتگو کریں گے اور وہ ہے قرآنی علوم کے بارے میں مستشرقین کی تحقیق۔ اس سلسلے میں پہلے تو ان لوگوں نے قرآن کے مغربی زبانوں میں ترجمے کیے بالخصوص انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی میں۔ پھر کچھ بڑے مستشرقین نے ترجمے کے ساتھ تفسیر کی طرف بھی توجہ کی۔ اس طرح کی سب سے مشہور کتاب قرآن مجید کا وہ ترجمہ اور تفسیر ہے جسے جارج سیل نے 1862ء میں انگریزی زبان میں شائع کیا۔ اس کے بعد آج تک مغرب میں جتنے ترجمے ہوئے ہیں وہ سب کے سب اسی کے خوشہ چین ہیں۔ جو غلطیاں سیل (sale) نے کی تھیں وہی بعد کے مترجمین نے